بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

معاشرتی واخلاقی زوال اور نجات کی راہ

ڈاکٹر انیس احمد

جب معاشی ، سیاسی ، ثقافتی اور معاشرتی اشاریے (indicators) یہ پتا دے رہے ہوں کہ قوم پستی کی طرف جا رہی ہے تو اس کے اسباب کا پتا لگانا ایک معاشرتی فریضہ بن جاتا ہے۔ یہ لازم ہو جاتا ہے کہ دیکھا جائے کہ اخلاقی امراض، یعنی معیشت میں دھوکا اور فریب، سیاست میں آمریت وکنبہ پروری اور بے ایمانی، معاشرت میں حقوق کی پامالی اور رشتوں کا احترام ختم کر دینے اور ثقافت میں رنگ رلیوں اور عریانیت کو 'آرٹ' اور 'فن' قرار دے دینے کا بنیادی سبب کیا ہے؟ کیا یہ اُس دورِ غلامی کا نتیجہ ہے جس سے مسلمان مغربی سامراج کے تسلط کے دور سے گزرے ہیں، یا یہ فلاح اور کامیابی کے معیارات کو گڈمڈ کرنے کا نتیجہ ہے، یا مقصدِ حیات کے شعور کا صحیح ادراک نہ ہونے کی بنا پر ہے؟ کیا یہ خرابی اچانک رونما ہوگئی ہے، یا مسلم ملت گذشتہ دوسو سال میں جن آزمایشوں سے گزری ہے، اس کا ایک منطقی نتیجہ ہے؟

قرآن کریم نے اقوام عالم کے عروج وزوال کے اہم تاریخی نشاناتِ راہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے متعدد اسباب وعوامل کا تذکرہ کیا ہے اور ان کے ذریعے غور وفکر کی راہیں روشن فرمائی ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے بنیادی بات یہ ہے کہ قرآنِ پاک نے معاشی ، سیاسی، ثقافتی اور معاشرتی عروج و زوال کا اصل سبب اخلاق کو قرار دیا ہے۔ یہ اخلاق انفرادی، خاندانی ، معاشرتی اور معاشی و سیاسی سطح پر فیصلہ کن عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ مغربی فکر میں اخلاق کے لیے عموماً دو اصطلاحات، یعنی Ethics (اخلاقیات) اور Morality (سیرت، کردار) کا استعمال کیا جاتا ہے۔

اوّلین اصطلاح فکری اور نظری پہلو کو اور ثانی الذکر اصطلاح اخلاق کے عملی پہلو کو ظاہر کرتی ہے۔ اسلامی روایت میں قرآن کریم اخلاق کی جامع اصطلاح میں نظری اور عملی پہلو کو یک جا کرتے ہوئے سیرت پاکؐ کو اخلاق کی کسوٹی قرار دیتا ہے۔ اس جامع اصطلاح میں عقیدے اور عمل کی بنیاد پر اخلاقی رویے کو انسانی تہذیب اور ثقافت کے عروج وزوال کا بنیادی سبب قرار دیتا ہے۔

مغرب کا ترقی کا معیار

ہم جس مادی دور میں زندگی گزار رہے ہیں، اس میں ترقی اور عروج کا پیمانہ: بیرون ملک میں محفوظ سرمایہ، کاروبار میں خواتین کے قائدانہ کردار، مختصر خاندان، ذاتی مکان اور کار اور مغربی تعلیم کے حصول کو قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک ملک یا قوم کے ترقی یافتہ، کم ترقی یافتہ، یا عدم ترقی یافتہ ہونے کا فیصلہ 'انسانی ترقی' کے انھی خودساختہ معیارات پر کیا جاتا ہے۔

ترقی اور استحکام کو ناپنے کے یہ پیمانے سامراجی اقوام اور سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار ہیں، جنھیں سرمایہ دارانہ فکر کے علَم برداروں نے اپنے تصورِحیات کی روشنی میں ایجاد کیا اور خود کو غالب تہذیب قرار دیتے ہوئے تمام دنیا کے انسانوں کو جانچنے کے لیے انھی 'مقدس پیمانوں' کو معیار قرار دیا۔ ان کی بنیاد پر اقوام عالم کی درجہ بندی کرنے کے ساتھ اقوام عالم کو یہ بات باور کروادی کہ وہ انھی پیمانوں کی روشنی میں ترقی یافتہ یا ترقی پذیر بن سکتی ہیں۔ اسی معیار کے پیش نظر ان ممالک کی تعلیم، معیشت، سیاست، معاشرت اور ثقافت کو قدیم، غیر ترقی یافتہ قرار دے کر انھیں اس دوڑ میں لگا دیا گیا کہ وہ خود کو مغرب کے سانچوں میں ڈھال کر اپنے مہذب اور ترقی یافتہ ہونے کے زعم میں مبتلا ہوسکیں۔

مغربی فکر کی نمایندگی کرتے ہوئے معروف امریکی تجزیہ کار سیموئیل پی ہن ٹنگٹن نے اس حقیقت کا سادہ الفاظ میں یوں اظہار کیا:

To be successful you must be like us, our way is the only way "The argument is that the religious values, moral assumptions and social structures of these (non-western) societies are at best alien and sometimes hostile to the values and practices of industrialism" (*The Clash of Civilizations and the Remaking of World Order*, London, 1997, p73).

کامیابی کے لیے آپ کو لازماً ہمیں پسند کرنا ہوگا۔ ہمارا راستہ ہی صرف واحد راستہ ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ ان (غیر مغربی اقوام) کی مذہبی اقدار، اخلاقی تصورات اور سماجی ڈھانچے، ہمارے سماجی و معاشی اور صنعتی نظام کی اقدار و روایات (انڈسٹریل ازم) کے لیے صرف نامانوس ہی نہیں بلکہ بسا اوقات دشمنی پر مبنی ہیں۔

گویا ترقی کے لیے صنعتی انقلاب کے بعد لادینی اور سرمایہ دارانہ مادیت جس کو یورپ نے اختیار کیا، ان کو اپنائے بغیر کوئی غیر یورپی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔

اسلام کا ترقی کا پیمانہ

اس کے مقابلے میں اسلام اخلاق کو ترقی کا پیمانہ قرار دیتے ہوئے یہ اصول پیش کرتا ہے کہ جو اقوام اخلاقی لحاظ سے مستحکم ہوں گی، وہی مادّی ترقی اور خود انحصاری حاصل کر سکیں گی۔ جن اقوام کے اخلاق اچھے ہیں تو ان کو ترقی کی ضمانت دی گئی، اور اگر اخلاق بدتر، ناپسندیدہ اور باطل ہیں تو انھیں متوقع تباہی و بربادی سے آگاہ کرنے کے لیے ماضی سے ایسی مثالیں پیش کی گئیں جنھیں کوئی فرد بھی جو دو آنکھیں اور دماغ رکھتا ہو، رد نہیں کر سکتا۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام نے جن اصولوں کو اپنایا، ان کے نتیجے میں تجارت، کاشت کاری، صنعتی ترقی، لوہے اور فولاد سے تیار کردہ ہتھیار وغیرہ اور غلے کی پیداوار میں فراوانی اور دولت میں کثرت پیدا ہوئی۔ اگر حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نے ناپ تول میں کمی کی، وعدوں کو پورا نہیں کیا، اور حضرت لوط علیہ السلام کی قوم نے اپنے خاندانی اخلاق کو ایک ایسے عمل سے تباہ کر دیا جس کا ارتکاب اس سے پہلے کسی انسان نے نہیں کیا تھا، تو اللہ کا غضب اور عذاب ان پر نازل ہوا۔ ان کے تعمیر کردہ محل، اس زمانے کی ایمپائر سٹیٹ بلڈنگیں اور وائٹ ہاؤس اور آزادی کے علامتی مینار زمین بوس ہو کر خاک میں مل گئے۔ ان کی مادی عظمت ان کے کسی کام نہ آئی اور تباہی کو نہیں روک سکی۔

ترقی اور خوش حالی کے لیے اسلام نے جس چیز کو معیار اور بنیادی پیمانہ قرار دیا، وہ انسان کا اخلاق ہے، جس کے ثمرات کے طور پر ذاتی زندگی میں تزکیہ اور انسانی معاشرے میں تعاون، اخوت، عدل و انصاف اور حقیقی خوش حالی رُونما ہوتے ہیں۔ حلال و حرام کے فرق کو سمجھتے ہوئے

صرف حلال روزی کو اختیار کرنا اور خصوصاً خود انحصاری کی پالیسی اختیار کرنا، انفرادی سطح پر اپنے ہاتھ سے روزی پیدا کرنا___ یہ تصورِ اسلامی، اسلامی ثقافت میں ایسی روایت بن گیا کہ کہ دورِ زوال کے کئی حکمران اس پر کاربند نظر آتے ہیں۔ ایسے فرماں روا مثالی اسلامی نظامِ حکومت سے انحراف کرچکے تھے اور خلافت کے بجاے بادشاہت جیسی حکمرانی کے مرض میں مبتلا تھے، اس کے باوجود اپنے ہاتھ سے قرآن کریم کی کتابت کر کے جو رقم ملتی، اسے اپنی ذات پر خرچ کرتے۔ گو ان کے سیاسی معاملات مکمل طور پر اسلامی اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتے تھے، لیکن پھر بھی ان کی زندگی دوسرے اربابِ اقتدار سے بڑی مختلف تھی۔ برعظیم میں اورنگ زیب عالم گیر اور دورِ عثمانی کے کئی بادشاہ اس کی مثال پیش کرتے ہیں۔

دورِ حاضر کے معاشی نظام اور معاشی ترقی کا بڑا انحصار سودی لین دین پر ہے۔ وہ تجارت ہو یا صنعت و حرفت، فرد ہو یا ادارہ اپنے کاروبار کے آغاز کے لیے کسی بنک سے قرض لینے کو ایک بنیادی ضرورت سمجھ کر کام کا آغاز کرتا ہے۔ پھر ساری عمر سود کی مقررہ شرح ادا کرنے کے لیے بھاری نفع پر اشیا فروخت کر کے ایک جانب سود کی اقساط ادا کرتا ہے ساتھ ہی صارفین کو اضافی نرخ پر اشیا فراہم کر کے اپنی ذاتی دولت میں اضافہ کرنا اپنا حق تصور کرتا ہے۔

بظاہر مادہ پرستی پر مبنی نظام پھلتا پھولتا نظر آتا ہے لیکن ۲۰۰۸ء کے عالمی معاشی بھونچال نے یہ بات ثابت کردی کہ سرمایہ دارانہ نظام کھوکھلا ہو چکا ہے اور اشتراکیت کے بعد اب اس کی مکمل تباہی کی باری ہے۔ ۲۰۰۸ء میں دنیا کے ۱۰۰ سے اُوپر معاشی مراکز میں اس نظام کے خلاف اسی نظام کے پروردہ افراد نے مظاہرے کیے اور عالمی منڈی میں بنکوں، تعمیراتی کمپنیوں اور معاشی اداروں نے اپنے کنگال ہونے کے کاغذات داخل کر کے اس نظام کے ناکام ہونے کے ناقابلِ تردید ثبوت فراہم کر دیے۔

مادیت اور ذاتی افادیت پر مبنی اس سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ اسلام جو نظام تجویز کرتا ہے وہ اخلاق کے اعلیٰ اصولوں، صدق شعاری، امانت و دیانت، پاس داریِ عہد، اشیا کی معیاری ضمانت (Quality Assurance) اور عدم استحصال کو معاشی پالیسی کے ستون قرار دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی معاشرے میں ترقی کے لیے خاندان کی اخلاقیات کو بنیاد قرار دیتا ہے۔ انفرادی اور اجتماعی

ہر دو سطحوں پر یہ نظام خود انحصاری کا علَم بردار ہے۔ قرآن کریم انبیاے کرامؑ کے معاشی معاملات میں خود انحصاری اختیار کرنے کی مثالیں دے کر سمجھاتا ہے کہ صحیح رویہ کون سا ہے؟ حضرت نوحؑ کا کشتی سازی (Ship Building) کی صنعت کو نقطۂ کمال تک پہنچانا اور حضرت داوٗدؑ کا فولاد سے زِرَہ، تلوار، ڈھال اور دیگر آلات کا تیار کرنا خود انحصاری کی اعلیٰ مثالیں ہیں۔

قرآن کریم ہمیں باربار یاددہانی کراتا ہے کہ دنیا میں ترقی اور آخرت میں کامیابی کا اگر کوئی درست طریقہ ہے تو وہ صرف قرآنی اخلاق اور اسوۂ حسنہ کی پیروی ہے۔ چنانچہ ماضی کی اقوام نے جب بھی اللہ تعالیٰ کے نازل کیے ہوئے اصولوں کی خلاف ورزی کی، وہ تباہی کے گڑھے میں جا گریں۔

اخلاقی انحطاط کا سبب

آج مسلم دنیا اور خصوصاً پاکستان جن زمینی مسائل کا شکار ہے، ان میں سرفہرست مسئلہ اخلاقی زوال ہے۔ برقی ابلاغ عامہ نے معاشرے کے اخلاقی ناسوروں کو ضرورت سے زیادہ بے نقاب کر کے اخلاقی گراوٹ کے احساس کو اور زیادہ شدید کر دیا ہے۔ ملک میں چلنے والے ہر ٹی وی چینل پر اگر کوئی خبر سرخی بنتی ہے تو وہ اخلاقی دیوالیے اور زوال ہی کی کسی شکل کو ظاہر کرتی ہے۔ مختلف اوقات میں بچوں اور خواتین کو درندگی کا نشانہ بنانے کے واقعات کو 'نشرِفحش' کا فریضہ سمجھ کر ابلاغی ادارے سنسنی اور مبالغے کے ساتھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ جیسے پاکستان اخلاقی خرابیوں میں 'سربراہی' کا مقام رکھتا ہو۔

اسی طرح اگر ملک میں طلاق کے رجحان کو دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ شاید ہم امریکا کو جو اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ طلاق زدہ ملک ہے، کچھ عرصے میں پیچھے چھوڑ جائیں گے۔ معاشی بدعنوانی، کرپشن کی خبریں دیکھی جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بدمعاملگی اور کرپشن میں شاید ہم ہی سرفہرست ہیں۔ تعلیم میں دیکھا جائے تو سرکاری اور نجی تعلیمی اداروں میں بدمعاملگی عروج پر نظر آتی ہے۔ اس حقیقت سے انکار کیے بغیر کہ واقعتاً یہ مسائل معاشرے میں پائے جاتے ہیں، مگر ابلاغ عامہ جس تباہ کن انداز میں انھیں پیش کر کے قوم میں مایوسی اور خودفراری کی کیفیت پیدا کرتا ہے، اسے قومی اور ملکی مفاد کے منافی اور طاغوتی فکر کی ایک سازش سے کم قرار نہیں دیا جاسکتا۔

صبح سے شام تک بچوں اور خواتین کے ساتھ جنسی زیادتی، خواتین کے عدم احترام، اپنی مصنوعات

فروخت کرنے کے لیے اشتہارات میں خواتین کے جنسی استحصال، تعلیم میں معیار کی گراوٹ، سیاست میں اصول فراموشی، معیشت میں حلال کی جگہ حرام کی پذیرائی اور معاشرت میں ہندووانہ اور مغربی رسموں اور رواج کو شعوری طور پر متعارف کرانے میں ایک ٹی وی چینل دوسرے سے بازی لے جانے میں لگا ہے، تو وہ سوچتا ہے کہ شاید ہم زوال کے اُس درجے پر پہنچ گئے ہیں جہاں سے واپسی ممکن نہیں اور ہر وقت یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ یہ پورا نظام دھڑام سے گرنے والا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ ذہنی اور نفسیاتی تاثر ہے جو ہمارا ابلاغ عامہ اور اس ابلاغ عامہ کی پرورش اور اسے غذا فراہم کرنے والے پس پردہ افراد اور ادارے چاہتے ہیں کہ قوم مایوس، دل برداشتہ اور نااُمید ہو۔ اسے یہ بات سمجھائی جائے کہ مغرب میں قانون کا احترام ہے، انسانی حقوق ہیں، معاشی اور سیاسی اخلاقیات ہے، اس لیے اپنے 'مذہب' اور روایات کو چھوڑ کر ہمارے لیے راہِ نجات مغربی لادینی معاشرت و سیاست، معیشت کو اختیار کرنے ہی میں ہے تاکہ ہم ترقی یافتہ بن سکیں۔ یہ وہ اصل ہدف ہے جو قوم میں مایوسی اور اضمحلال پیدا کرنے کے نتیجے میں حاصل کرنا مقصود ہے۔

قبل اس کے کہ ہم ان مسائل کے حل کی طرف آئیں، اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ دن رات مایوسی، دہشت گردی، جنسی درندگی کی خبریں سن سن کر ایک احساس یہ بھی ابھرتا ہے کہ یہ قوم ہے ہی ایسی بدکردار اور بدبخت کہ اسے صرف کوئی جابرانہ اور آمرانہ نظام ہی آکر ٹھیک کرسکتا ہے۔ اس تناظر میں سابقہ آمرانہ ادوار کی طرف بھی اشارے کیے جاتے ہیں کہ جب بھی آمرانہ دور آیا معیشت میں بہتری ہوئی۔ اس لیے آج جو مسائل پائے جاتے ہیں انھیں کوئی آمر ہی ڈنڈے کے زور سے ٹھیک کرسکتا ہے۔

حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اسی قوم کے افراد جب امریکا کے اعلیٰ ترین ہسپتالوں میں یا برطانیہ کے ہسپتالوں میں کام کرتے ہیں، تو مقامی گوری نسل کے افراد سے کہیں زیادہ فنی مہارت اور ایمان داری کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس قوم کے کم تعلیم یافتہ معاشی کارکن جب متحدہ عرب امارات میں گاڑی چلاتے ہیں تو مکمل طور پر ٹریفک کے قوانین پر عمل کرتے ہیں۔ اس کے انجینیر اعلیٰ معیار کی سڑکوں کا جلیبی نما جال بچھانے میں دنیا بھر میں اپنی مہارت کا لوہا منواتے ہیں۔ گویا مسئلہ نہ جین (gene) کا ہے، نہ قوم کی فطرت کا، بلکہ اس کی تربیت اور نظام زندگی میں

بنیادی خرابی کا ہے۔ مزید یہ خود اپنے بارے میں اپنی کم حیثیتی (underestimation) کا ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ مسلم دنیا میں ہی نہیں پورے خطے میں پاکستان ایک بڑی جوہری قوت ہے۔ ملک میں بہ ظاہر بجلی کی کمی کے باوجود اس ملک میں آیندہ ۵۰۰ سال کے لیے کوئلہ کی شکل میں قوت کے ذخائر موجود ہیں۔ پاکستان کا ایک بڑا سرمایہ اس کے ۷۰ فی صد کے قریب نوجوان ہیں جن کی صحیح تعلیم و تربیت نہ صرف ملک کے اندر بلکہ عالمی طور پر انسانی وسائل کے استعمال سے صنعتی، سیاسی، ثقافتی اور اخلاقی انقلاب لانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ مٹی نہ صرف نم ہے بلکہ اس میں مکمل روئیدگی موجود ہے۔ صرف اسے اخلاق کے تریاق سے کامیابی تک لے جانے کی ضرورت ہے۔

● **معاشی اخلاقیات**: قرآن کریم نے تجارت کو نہ صرف حلال قرار دیا ہے اور ناپ تول کے پیمانوں کو ایمان داری سے استعمال کرنے پر زور دیا ہے، بلکہ تجارت کو خصوصاً اور کاشت کاری کو عموماً معاشی فلاح کے فروغ کی ایک بنیاد بتایا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ناپ تول میں کمی کرنے والوں کو حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کی مثال دے کر یہ بات سمجھائی ہے کہ معاشی اخلاقیات پر عمل نہ کیا گیا تو انجام تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایمان دار تاجر کے بارے میں پیش گوئی کی ہے کہ وہ آخرت میں انبیا، صلحا اور شہدا کی صف میں شامل ہوگا۔ اسلام نے اس دنیا میں ایسے کردار پیش کیے، جو مکہ سے آئے تو خالی ہاتھ تھے، لیکن مدینہ کے بازار میں جاکر صرف پنیر سے کاروبار کا آغاز کر کے اپنی ایمان داری کے سبب اُس دور کے کروڑ پتی افراد میں شامل ہوگئے۔ دوسری جانب یہ کتابِ عزیز ان کرداروں کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے جن کی مالی کثرت ان کے خزانوں کی کنجیوں کے بوجھ سے ظاہر ہوتی تھی لیکن وہ دنیا اور آخرت میں اپنی معاشی بدمعاملگی کی بنا پر تباہ و برباد کردیے گئے۔ ہامان اس رویے کی نمایندگی کرتا ہے۔

● **سیاسی اخلاقیات**: سیاسی میدان میں خودنمائی، مشاورت پر عمل نہ کرنا، اپنے آپ کو کسی کے سامنے جواب دہ نہ سمجھنا بلکہ خود کو انسانوں کا رب سمجھنا، وہ عظیم غلطی ہے جو بڑی بڑی تہذیبوں اور مضبوط اقوام کی تباہی کا سبب بنی۔ فرعون اور اس جیسے سیاسی فرماں روا، یونان اور روم و ایران کے ایوانِ اقتدار پر قابض افراد، سب سیاسی شرک اور اللہ کی حاکمیت کا انکار کرنے کے سبب تباہ و برباد ہوئے۔

● **ثقافتی اخلاقیات:** جن اقوام نے اپنی تہذیب کو لھو الحدیث (وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّشۡتَرِىۡ لَهۡوَ الۡحَدِيۡثِ لِيُضِلَّ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ ۖ، اور انسانوں ہی میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کلام دِلفریب خرید کرلاتا ہے، تاکہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے علم کے بغیر بھٹکا دے۔ لقمان ۳۱:۶) کی شکل دے دی اور قصہ گو، رقص اور تماشے کرنے والوں کو اپنا ہیرو اور مثال بنایا اور انھیں اعلیٰ قومی اعزاز دیے، جب کہ اہلِ علم و فکر و تقویٰ کے لیے زمین کو تنگ کر دیا--- وہ اقوام اپنی تمام تر مادی قوت کے باوجود صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔ وہ شام اور مصر کی تہذیب ہو یا روم و کسریٰ کے تخت ہوں، کوئی قوت ان کو زوال سے نہ روک سکی۔

● **معاشرتی اخلاقیات:** جن اقوام نے اپنی معاشرت کو ہوائے نفس کا تابع بنا دیا اور اللہ کی جانب سے عطا کردہ اعلیٰ اخلاقی اقدار کو رد کر کے ان کی جگہ وہ طریقے ایجاد کیے جو غیر فطری تھے، اور اس سے پہلے انسانیت میں استعمال نہیں ہوئے تھے (قرآن کریم صراحت سے بیان کرتا ہے کہ قومِ لوط کا عمل ان سے پہلے انسانوں میں رائج نہ تھا)، تو نتیجتاً انھیں بربادی سے کوئی نہ روک سکا۔ آج کے دور میں جنسی آزادی کے زیرعنوان ان غیر فطری اعمال کو 'بنیادی انسانی حقوق' بنا کر پیش کیا جا رہا ہے اور مسلم معاشروں میں بھی بچوں کی تعلیم میں ان 'حقوق' کے 'احترام' کو داخل کیا جا رہا ہے۔ یہ اور اس نوعیت کے دیگر طریقے جن میں مخلوط تعلیم، ابلاغ عامہ کا ہر موقعے پر مخلوط ماحول کو نمایاں کرنا اور معاشرت میں بداخلاقی کے سبب طلاقوں کا بڑھ جانا، یہ وہ عوامل ہیں جو کسی تہذیب اور ملت کی بنیادوں کو دیمک کی طرح چاٹ کر کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ نتیجتاً پورا معاشرہ یکایک اپنی عظیم الشان ظاہری شکل کے باوجود زمین بوس ہو جاتا ہے۔

نظامِ زندگی کا مقام

اگر معروضی طور پر دیکھا جائے تو انسانوں کے رویے، طرزِعمل اور معاملات ان کے تصورِ زندگی اور مقصدِ حیات کا عکس ہوتے ہیں۔ اگر ایک قوم یہ سمجھتی ہے یا اس کی تعلیم و تہذیب اسے یہ سکھاتی ہے کہ دنیا کی زندگی کا مقصد مسخرا پن (fun)، لذت اندوزی (enjoyment)، پُرسُرور مشغولیت (entertainment) اور ذاتی نفسیاتی انگیخت (self-stimulation) کا حصول ہے، تو پھر معیشت ہو یا معاشرت یا ثقافت، ہر شعبے میں اس کا عکس پایا جاتا ہے۔ معیشت کے

میدان میں وہ اشیا جو زندہ رہنے کے لیے ضروری ہیں، غیرضروری بن جاتی ہیں۔ ساری معیشت وہ سامانِ عیش وعشرت پیدا کرنے میں لگ جاتی ہے جو خود پرستی اور مصنوعی طور پر اپنی ذات کو نمایاں کرنے میں مددگار ہو۔ آرایشی مصنوعات (cosmetics)، طرح طرح کے جنسی ترغیب والے عطریات اور غازے نہ صرف خواتین کے لیے بلکہ مردوں کے لیے، اور جنسی آوارگی کے بہت سے پُرتعیش سامانِ معیشت کے میدان پر چھا جاتے ہیں۔ چنانچہ کسی بھی بڑے شاپنگ سنٹر میں کثرت سے وہ دکانیں نظر آتی ہیں جہاں یہ سامان موجود ہوتا ہے۔ اس میں نشہ آور ادویات، مشروبات، نیم عریاں لباس، فحش کتب، ویڈیو اور آڈیو مواد، حتیٰ کہ موبائل پر تمام خبیث اور فحش مواد کی فراہمی معیشت کا حصّہ بن جاتی ہے۔

اگر مقصدِ حیات محض دولت کا حصول ہو تو پھر تعلیم گاہوں میں وہ مضامین پڑھائے جاتے ہیں جن کی بازار میں مانگ ہو اور ہر طالب علم سرمایہ دارانہ نظام کا ایک گرگا بن کر نکلتا ہے، جو انسانوں کا خون چوس کر اپنی ہوس پوری کرنے کو اپنی معاشی فتح سمجھ کر شادیانے بجاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اگر مقصدِ حیات ایک ذمہ دارانہ اخلاقی زندگی گزارانا ہو تو معیشت ہو یا سیاست، ثقافت ہو یا معاشرت، ان سب کی اقدار اور بنیادیں بدل جاتی ہیں اور وہ معاشرہ وجود میں آتا ہے جس میں مدینہ اور مکہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ لیکن ایسا کیوں نہیں ہو پاتا؟ انسانی ذہن اس طرف کیوں نہیں جاتا؟ وہ کیوں چمک دمک میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور زندگی جیسی قیمتی شے کو مشروب کے ایک پیمانے میں ڈبو کر غرق کر دیتا ہے؟

بات کچھ ایسی مشکل بھی نہیں۔ قرآن کریم نے ان تمام امراض کے پیدا ہونے اور معاشرے میں فتنہ وفساد، معیشت میں سودی لعنت، معاشرت میں ظلم و استحصال، ثقافت میں عریانیت و لذت پرستی اور سیاست میں فرعونیت کو دور کرنے کا آسان حل تجویز کیا ہے اور وہ ہے توحیدی نظام۔ یعنی زندگی سے تضادات کو ختم کر کے بہت سارے خداؤں کی جگہ صرف اور صرف اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی بندگی میں آ جانا۔ یہ کام محض انسانوں کے اللہ کی بندگی میں آ جانے سے نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے پورے نظام کو آمریت، لادینیت اور ثنویت کے بتوں سے نجات دلا کر اللہ وحدہٗ لاشریک کی بندگی میں لانے سے ہی ہوسکتا ہے۔

توحیدی نظامِ حیات

شرک محض اللہ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ کی جگہ تین یا بہت سے خداؤں کے ماننے کا نام نہیں ہے، بلکہ زندگی کو مختلف خانوں میں تقسیم کر دینے کا نام ہے۔ ایک خانہ حصول مال کا، ایک خانہ حصولِ اقتدار کا، ایک خانہ تفریح اور لذت کے حصول کا، اور ایک خانہ ہفتے میں ایک دن عبادت یا دن میں چند بار اللہ کو یاد کرلینے کا۔ اس کے مقابلے میں توحید کا مطالبہ ہے کہ انسان زندگی کے تمام معاملات کو الہامی اخلاقیات کے ضابطے میں لائے۔ اس کی معیشت حلال اور غیر استحصالی ہو۔ اس کی معاشرت باحیا ہو۔ اس کی ثقافت تعمیری ہو۔ اس کی سیاست عدل و توازن پر مبنی ہو۔ لیکن یہ سب کچھ جاننے کے باوجود پھر اس پر عمل کیوں نہیں ہوتا؟

اس خرابی کا ذمہ دار اس کا زندگی کا تصور ہوتا ہے، یعنی وہ زندگی کو ایک اکائی تصور نہیں، بلکہ شعوری یا غیرشعوری طور پر زندگی کو دو خانوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک کو مذہب و اخلاق کا نام دیتا ہے اور باقی زندگی کو دنیا۔ اس طرح زندگی میں ثنویت اور دورنگی (dualism) اور لادینیت یا سیکولرازم کو رائج کرتا ہے۔ کسی بھی انسانی معاشرے میں جب تک یہ تقسیم رہے گی، وہ ان تمام کمزوریوں کا شکار رہے گا جن کا تذکرہ اُوپر کیا گیا ہے۔ جب تک ایک شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ بطور سیاست دان جو وعدے چاہے کرسکتا ہے تاکہ اسے ووٹ ملیں، اور وہ کسی نہ کسی طرح سربراہ مملکت بن جائے، اور ساتھ ہی وہ پابندی سے نماز بھی پڑھتا ہے، تو وہ عملاً ایک سیکولر شخص ہے۔ اگرچہ وہ ہر چھے ماہ میں عمرہ کرتا ہو۔ ساتھ ہی اس کا سارا کاروبار سودی قرض پر چل رہا ہو اور وہ تجارتی معاملات میں صرف اپنے مفاد اور منافع کو اپنا 'خدا' مانتا ہو۔ اپنی تمام 'مذہبیت' کے باوجود ایسا شخص صحیح معنوں میں سیکولر ہے۔

اگر ایک استاد اپنی یونی ورسٹی یا کالج یا مدرسے میں جو مضمون پڑھاتا ہے، اس مضمون کی بنیاد عوام کی حاکمیت کے تصور پر ہے یا صرف دولت اور قوت کے حصول پر ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو کوئی حکمت عملی اختیار کر کے وہ اقتدار پر قابض ہوجائے اور معاشی وسائل پر قبضہ کرلے تو وہ سیکولر تصورِ حیات کی تدریس کر رہا ہے، چاہے وہ پنج گانہ نماز کے ساتھ تہجد بھی پڑھتا ہو، اور اس نے قرآن کریم کے اجزا بھی حفظ کر رکھے ہوں۔ چونکہ وہ زندگی کو دو خانوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک رات

کی تنہائی میں اللہ جل شانہٗ کے سامنے اظہارِ بندگی اور دوسرے دن کے ہر لمحے میں دولت، اقتدار، شہرت کے خدا کے سامنے سجدہ ریز ہونا۔ جب تک زندگی سے یہ دوعملی یا لادینیت خارج نہیں ہوتی، جس کو اسلام نے لا الٰہ الا اللہ کے جامع کلمے سے تعبیر کیا ہے، اس وقت تک اس شخص نے توحید کو سمجھا، نہ اس کا مزہ چکھا۔

قرآن ایسے ہی لوگوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے: اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ (البقرہ ۲:۸۵) ''کیا تم کتاب کے ایک حصّے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصّے کے ساتھ کفر کرتے ہو؟'' اور تمام انسانوں سے جو اللہ کی حاکمیت کے منوانے کے دعوے دار ہیں، مطالبہ کرتا ہے کہ دین میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ اس لیے کہ زندگی کو خانوں میں تقسیم کرنا شیطان کا راستہ ہے، رحمٰن کا نہیں۔ ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۠ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ؀ (البقرہ ۲:۲۰۸) ''تم پورے کے پورے اسلام میں آجاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمھارا کھلا دشمن ہے''۔

امام ابن تیمیہؒ، شاہ ولی اللہؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ، علامہ محمد اقبالؒ اور سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اسلام کے اس جامع تصور کو پیش کیا ہے۔ اس میں اقامت دین کا مطلب وہ کوشش ہے جو اللہ کی زمین پر اللہ کی حاکمیت قائم کرنے کے لیے ہو، اور اس جدوجہد کو کرنے کے لیے وہ افرادِ کار تیار کیے جائیں جو ہوا کا رخ دیکھ کر اپنی شناختِ نو (re-branding) کی جگہ اپنی دعوت، اسلام کا مکمل نظام، اور اسلام میں پورے کا پورا داخل ہو جانے کا عزم رکھتے ہوں۔ جس میں ذاتی زندگی، معاشی معاملات، سیاسی سرگرمی اور اہداف، ہر چیز توحید کے تحت ہے۔ اس میں خالص سیاسی اور خالص تربیتی اور دعوتی تقسیم کی کوئی گنجایش نہیں پائی جاتی۔ روایتی علما نے جو دین اور دنیا کی تقسیم کے قائل تھے، جماعت اسلامی اور مولانا مودودی پر اسلام کو سیاسی رنگ دینے اور سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا الزام لگایا اور بعض نے اس بنا پر جماعت اسلامی سے علیحدگی اختیار کر لی۔ جماعت اسلامی کا امتیاز ہی یہ ہے کہ اس کی دعوت محض انفرادی اصلاح تک محدود نہیں، یہ کام تو صوفیہ اور بہت سے دوسرے اللہ کے بندے انجام دے رہے تھے۔ اس کی دعوت زمامِ کار کی تبدیلی کے لیے ایسے افراد کی تیاری اور تنظیم کی تھی اور ہے، جو اسلام کو اپنی زندگی میں مکمل طور پر نافذ کر چکے ہوں۔

اس کی قوت عددی یا پارلیمنٹ کی نشستوں میں نہیں تھی بلکہ افرادِکار کے علم، تقویٰ اور فراستِ دینی میں تھی۔ دوسرے الفاظ میں یہ دعوتی سعی و جہد، تزکیہ اور سیرت سازی کی مساعی ہے۔ اجتماعی اور سیاسی تبدیلی کے لیے جدوجہد ایک دوسرے سے مربوط اور کُلی تبدیلی کے مختلف پہلو اور ایک دوسرے کے لیے تقویت کا ذریعہ ہیں۔

جب تعلیم کی بنیاد سیکولرازم پر ہو جیسا کہ آج عملی طور پر ہو رہا ہے، تو پھر مسلم دنیا کے مدارس وہ دینی ہوں یا دنیوی، دونوں نظام دین و دنیا کی علیحدگی کے اصول کو عملاً اختیار کیے ہوئے ہیں، اور ثنویت اور دورنگی کی وجہ سے معاشی، سیاسی اور معاشرتی بحران کا شکار ہوجاتے ہیں۔ وہ اسلام کے توحیدی تصور سے دور غیرشعوری طور پر قریب المیعاد سیاسی کامیابی کے حصول پر توجہ کے سبب طاغوتی جال کا شکار ہوجاتے ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سیکولرازم کے زیرسایہ جو نظام بھی کام کرے گا وہ آج نہیں تو کل انسانی ذہن کو الحاد کی طرف لے کر جائے گا۔ جب انسان یہ دیکھتا ہے کہ سودی کاروبار کرنے والا ایک شخص جو کل تک ایک چھوٹی دکان کا مالک تھا، آج ایک بڑے کاروبار کا مالک ہے، تو زندگی کی تقسیم کے زیراثر یہ سوچنے پر آمادہ ہوجاتا ہے کہ اصل زندگی تو دولت اور قوت والی ہی ہے۔ اس طرح شیطان اپنے اس مقصد کے حصول میں کامیاب ہو جاتا ہے جس کا اظہار اس نے جنت سے نکالے جانے سے قبل کیا تھا کہ وہ انسانوں کو لبھائے گا، للچائے گا، بہکائے گا، اور گمراہی میں مبتلا کر کے ایسے کلمات تک کہنے پر آمادہ کر دیتا ہے کہ: اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿۲۴﴾ (النزعٰت ۷۹: ۲۴) ''میں تمھارا سب سے بڑا ربّ ہوں''۔

مسائل کا حل: اسلامی نظامِ حکومت

آج جو اخلاقی زوال، بے راہ روی، گمراہی، جنسی جرائم، قتل و غارت، چوری اور ذخیرہ اندوزی اور سیاسی حقوق کی پامالی کی شکل میں ہمیں نظر آرہا ہے، اسے دُور کرنے کے لیے وہی حکمت عملی اختیار کرنی ہوگی جو ہادی اعظمؐ اور محسن انسانیتؐ نے اُس دورِجاہلیت میں استعمال کی جو آج کے دورِجاہلیت سے مختلف نہ تھا۔ اُس بگڑے معاشرے کی فکری تطہیر اور عمل کے تزکیے کے لیے توحید کا صحیح شعور پیش کرنا لازم کیا گیا تھا۔ بالکل اسی طرح آج الکتاب سے وابستگی اور براہِ راست اس کی ہدایات کو سمجھ کر زندگی کے تمام شعبوں میں نفوذ کا چیلنج درپیش ہے۔ معاشرے کی اصلاح کے

لیے ان صالح افراد کو تلاش کرنا ہے، جو معاشرے میں اگرچہ موجود ہیں اور وہ ہدایت کو تلاش بھی کررہے ہیں، لیکن ہم ابھی ان تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ آگے بڑھ کر ہمیں ان کو منظم کرنا ہوگا۔ ان کے ایسے حلقے قائم کرنے ہوں گے جہاں وہ قرآن وسنت کو نہ صرف سمجھ سکیں بلکہ زندگی کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کا ذریعہ بن سکیں اور اس طرح عملی شکل میں اس کے نمونے بن سکیں۔ نیز اس تنظیم کے افراد کے ذریعے معروف کو قائم کرنے اور منکر، بدی اور برائی کو دُور کرنے کے لیے غیرحکومتی بنیادوں پر ایسے ماڈل نظامِ عدل و احسان کو قائم کرنا، جو قرآن وسنت کی تعلیمات و ہدایات کو ایک محدود پیمانے پر معیشت، معاشرت، سیاست، ثقافت اور تعلیم کے میدان میں، غرض زندگی کے تمام اہم شعبوں میں، اپنی اپنی جگہ عملی طور پر ایک چھوٹی ریاست کی شکل میں قائم کرکے دکھادیں۔

دین کی یہ اقامت معاشرتی سطح پر وہ نمونہ پیش کرے گی جو تحریک اسلامی ملکی سطح پر قائم کرنا چاہتی ہے۔ اس کام کی نصرت اور امداد کا وعدہ رب کریم نے خود فرمایا ہے کہ وہ ان افراد کی استعانت کرے گا جو اس کے راستے میں نکلیں گے اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کو اپنی ذاتی زندگی میں، گھر اور خاندان میں، معاشرے اور معیشت میں، ثقافت و تعلیم میں نافذ کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ ان کی مدد فرشتوں سے کرے گا۔

اس پہلو کو پیش نظر رکھتے ہوئے تحریک اسلامی کو معاشرے کے صالح عنصر کو منظم کرنا ہوگا اور ایسا نظامِ تربیت تیار کرنا ہوگا جو فکری اور عملی لحاظ سے ہر گاؤں اور قریے میں ایسے افراد معاشرے کے سامنے پیش کرسکے، جنھوں نے تمام حاکمیتوں کی نفی کرکے صرف اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی حاکمیت کو اپنی فکر، اپنے خاندان، اپنے کاروبار، اپنی سیاست اور اپنی دعوتی زندگی میں رائج کردیا ہو۔ اصل سرمایہ وہ اخلاقی رویہ ہے جو غیرنمایشی ہو، خلوصِ نیت پر مبنی ہو، اور جسے صلے کی طلب نہ ہو۔ انبیاے کرامؑ کا کہنا صرف یہ تھا کہ وہ انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتے ہیں اور ان سے کوئی اجر نہیں مانگتے۔ ربِ کریم اس طرزِعمل سے خوش ہوکر انھیں زمین میں اپنا وارث بناتا ہے اور اس طرح وہ اخلاقی انقلاب برپا ہوتا ہے جو معاشرے کو مثالی نمونہ بنادیتا ہے۔ یہ جدوجہد بالآخر اسلامی نظامِ حکومت کے قیام پر منتج ہوکر رہتی ہے۔

معاشرے میں صالح افراد کی تیاری کے ساتھ ساتھ خدمت خلق کا ایسا کام جس میں صلے کی

خواہش نہ ہو، صرف ربّ کی رضا مقصود ہو، کامیابی کی ضمانت ہے۔ خدمت خلق کسی منفعت کے حصول کے لیے کرنا، تمام اُخروی اجر کو ضائع کر دینا ہے۔ یہی وہ دعوت کی کامیابی کا راز ہے جسے ایک عام نظر نہیں دیکھ سکتی کیوں کہ ایک عام نظر قریبی فاصلوں اور منزلوں کو حقیقی سمجھتی ہے۔ ایک دُوررس تحریکی نگاہ اُخروی کامیابی کے پیش نظر فوری مفاد کو نظرانداز کر کے استقامت، صبراور حکمت دینی کے ساتھ نتائج سے بے پروا ہو کر اپنا تن من دھن، فکر و صلاحیت، اپنا ہر سانس اور ہر قطرۂ خون دعوت کی آبیاری میں لگا دیتی ہے کہ اصل کامیابی آخرت کی ہے۔ دنیا میں صرف رب کریم کی عنایت وفضل سے اگر اختیار و اقتدار ملے تو وہ صرف اُس کی میراث ہے اور وہی اس میراث کو دینے والا ہے۔ اُسی کو علم ہے کہ وہ کتنے عرصے میں میراث اپنے بندوں کو دیتا ہے۔ اسلامی انقلابی دعوت وقت کے پیمانوں سے آزاد ہے۔ اس کا سارا تعلق اخلاص نیت اور بے لوث جدوجہد سے ہے۔ یہ اللہ کی رضا کے حصول کو اپنا ہدف قرار دیتی ہے، اور جب یہ کام استقامت سے کیا جاتا ہے تو بالآخر زمامِ کار اس کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے جو پورا ہو کر رہتا ہے۔